TAHREER
Journal of Languages & Literature
eISSN:3007-2085
pISSN:3007-2077
تحریر
Vol. 4 No. 1 (2026) HEC approved in the Y category.

The Evolution of Urdu Literary Historiography: From Traditional Narrative to Modern Interdisciplinary Consciousness

اردو ادبی تاریخ نگاری کا ارتقا: روایتی تذکرہ نگاری سے جدید بین العلومی شعور تک

Shahzad Masih[1], Dr. Mubshar Saeed Bajwa[2]
[1]M.Phil. Scholar, [2]Assistant Professor, Dept. of Urdu, Superior University Faisalabad
Correspondence Email: shahzadmasih826@gmail.com
DOI: https://doi.org/10.65827/tahreer.v4i1.70

Abstract
This research paper traces the evolutionary trajectory of Urdu literary historiography, analysing its transition from traditional biographical accounts (Tazkiras) and data compilation to modern, interdisciplinary interpretations. The study provides a comparative analysis of prominent historians, including Hamid Hasan Qadri, Professor Waqar Azeem, Dr Anwar Sadeed, and Dr Jameel Jalibi, highlighting their respective contributions in systematising prose history, institutional roles, and scientific research methodologies. However, the focal point of this research is the paradigm shift introduced by Dr Tabassum Kashmiri. The paper argues that the Kashmiri revolutionised Urdu historiography by adopting the French Annales School of thought, thereby integrating sociology, economics, and psychology into the historical narrative. Unlike his predecessors, who focused primarily on chronological authenticity, Kashmiri utilised psychoanalysis to explore the inner worlds of poets like Mir Taqi Mir and revisited the Lucknow School through a cultural rather than moralistic lens. The study concludes that Urdu literary history has evolved from a dry record of events into a creative, organic narrative that interprets literature as a collective social and psychological phenomenon.

Keywords:
Urdu Literary Historiography, Dr Tabassum Kashmiri, Dr Jameel Jalibi, Annales School, Interdisciplinary Approach, Psychoanalysis in Literature, Lucknow School (Dabistan-e-Lucknow), Cultural Consciousness

Received: 26-12-2025 **Accepted:** 05-03-2026 **Online:** 16-03-2026

This article is licensed under the Creative Commons Attribution (CC BY 4.0).
Free use, distribution, and reproduction permitted with proper citation of the original work.
© The Author(s).

اردو ادب کی تاریخ نگاری کا سفر محض واقعات کے اندراج کا نام نہیں بلکہ یہ ایک ارتقائی عمل ہے جو تذکرہ نگاری کی دھندلی فضاؤں سے نکل کر باقاعدہ فن کی شکل اختیار کرتا ہے۔ بیسویں صدی سے قبل اردو ادب کے تاریخی نقوش زیادہ تر تذکروں، مکتوبات اور

ملفوظات میں بکھرے ہوئے تھے، جن میں تحقیق سے زیادہ عقیدت اور تنقید سے زیادہ تحسین کا پہلو نمایاں تھا۔ تاہم، بیسویں صدی کے آغاز کے ساتھ ہی ادبی مورخین نے شعوری طور پر اس خلا کو پُر کرنے کی کوشش کی اور خاص طور پر اردو نثر کے ارتقاء کو ایک اختصاصی موضوع کے طور پر اپنایا۔

اس ضمن میں حامد حسن قادری کی تصنیف ''داستانِ تاریخِ اردو'' ایک سنگِ میل کی حیثیت رکھتی ہے۔ یہ کتاب اردو نثر نگاروں کی پہلی مربوط اور مبسوط تاریخ تصور کی جاتی ہے، جس نے انیسویں صدی کے اختتام تک کے نثری سرمایے کا احاطہ کیا۔ حامد حسن قادری نے تحقیق کی ایک نئی داغ بیل ڈالی جس میں انہوں نے نہ صرف دکن اور شمالی ہند میں نثر کے ابتدائی نمونوں کو کھوجا بلکہ صوفیائے کرام کے کردار کو بھی نمایاں کیا۔ ان کی اس کاوش نے ادبی تاریخ کو محض شاعری کے تذکروں سے نکال کر نثری ارتقاء کے سنجیدہ مطالعے کی طرف موڑا۔ اس کتاب کی اہمیت اور علمی حلقوں میں اس کی پذیرائی کے حوالے سے مصنف خود لکھتے ہیں:

> ''داستان تاریخ اُردو پہلی مرتبہ نومبر ۱۹۴۱ء میں شائع ہوئی تھی چھپتے ہی میں نے بہت سے ادیبوں، نقادوں، پروفیسروں اور ایڈیٹروں کو کتاب بھجوائی۔ سب سے پہلے ۳۱ دسمبر، ۱۹۴۱ء کو ڈاکٹر مولوی عبدالحق صاحب نے دہلی سے ریڈیو پر اس کے متعلق تقریر نشر کی۔ پھر دلی، لکھنو، حیدرآباد دکن سے دوسرے نقادوں نے بھی ریڈیو پر تبصرہ کیا۔''(1)

نثر کے اختصاصی مطالعے میں ایک اہم موڑ اس وقت آیا جب مورخین نے روایتی مراکز (جیسے فورٹ ولیم کالج اور علی گڑھ) سے ہٹ کر دیگر محرکات کا جائزہ لینا شروع کیا۔ عام طور پر اردو نثر کی تاریخ کا آغاز فورٹ ولیم کالج کی داستانوں یا پھر سرسید تحریک کی عقلیت پسندی سے جوڑا جاتا تھا، جس کے نتیجے میں علماء اور مذہبی طبقے کی نثری خدمات پسِ منظر میں چلی جاتی تھیں۔ ڈاکٹر محمد ایوب قادری نے اپنی تصنیف ''اردو نثر کے ارتقاء میں علماء کا حصہ'' کے ذریعے اس تاریخی خلا کو پُر کیا۔ انہوں نے تقریباً ۱۸۰ ایسے علمائے کرام (جیسے شاہ ولی اللہ کے صاحبزادگان، سید احمد شہید کی تحریک کے رفقاء، اور روہیل کھنڈ و اودھ کے علماء) کی نشاندہی کی جنہوں نے اردو نثر کو عوامی اور علمی سطح پر روشناس کرانے میں کلیدی کردار ادا کیا۔ یہ کتاب اس بات کا ثبوت فراہم کرتی ہے کہ اردو نثر کی ساخت و پرداخت میں مدرسوں اور خانقاہوں کا کردار کسی بھی طرح جدید تعلیمی اداروں سے کم نہ تھا۔ ڈاکٹر محمد ایوب قادری روایتی تاریخ نگاری کے اس یک رُخے پن پر تنقید کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

> ''اُردو زبان کی نثر کی تاریخ لکھنے والوں کا بالعموم یہ طریقہ رہا ہے کہ وہ فورٹ ولیم کالج کی ادبی سرگرمیوں سے اس کا آغاز کرتے ہیں۔ خطوط غالب پر اظہار خیال کرتے ہیں۔ پھر شاہ عبدالقادر، شاہ رفیع الدین یا دو چار مذہبی کتابوں مثلاً تقوۃ الایمان، وغیرہ کا ذکر کرتے ہوئے سرسید تحریک پر آجاتے ہیں۔ اُردو نثر کے ارتقاء میں دیگر علماء کے کارناموں کو یکسر نظرانداز کر جاتے ہیں۔''(2)

اسی تسلسل میں ڈاکٹر عابدہ بیگم کا تحقیقی کام ''اردو نثر کا ارتقاء (۱۸۰۰ء سے ۱۸۵۷ء تک)'' بھی ابتدائی نقوش کی بازیافت میں ایک اہم کڑی ہے۔ یہ کتاب اس مخصوص دور کا احاطہ کرتی ہے جب اردو نثر مذہبی دائرے سے نکل کر دنیوی اور افسانوی ادب کی طرف گامزن تھی۔ ڈاکٹر عابدہ بیگم نے ۱۸۵۷ء کی جنگِ آزادی سے قبل کے اس عبوری دور کا جائزہ لیتے ہوئے فورٹ ولیم کالج کے ساتھ ساتھ دلی کالج اور ابتدائی اردو صحافت کے کردار کو بھی اجاگر کیا۔ ان کے نزدیک غیر مذہبی نثر اور داستانوی طرزِ بیان کا باقاعدہ آغاز اٹھارویں صدی کے اواخر اور انیسویں صدی کے اوائل میں ہوا، جس نے بعد میں جدید نثر کی بنیاد رکھی۔ انہوں نے ثابت کیا کہ سر سید تحریک کے بیج دراصل ۱۸۵۷ء سے پہلے ہی بوئے جا چکے تھے۔ اس عبوری دور میں نثر کی بدلتی ہوئی ہیئت کے بارے میں ان کا تجزیہ ملاحظہ ہو:

> ''اُردو میں غیر مذہبی نثر کے نمونے دراصل اٹھارویں صدی کے اواخر کی دین ہیں نوطرز مرصع، قصہ مہر افروز دلبر، نوآئین ہندی عرف قصہ ملک محمد و گیتی افروز اور عجائب القصص سے غیر مذہبی نثر اور داستانوی طرز بیاں کی ابتداء ہوتی ہے۔''(3)

اردو ادب کی تاریخ نگاری کا ایک اہم موڑ وہ ہے جب مؤرخین نے انفرادی کاوشوں سے نگاہ ہٹا کر ادبی ارتقاء کو اداروں اور تحریکوں کے اجتماعی دھارے میں تلاش کرنا شروع کیا۔ یہ منہاج اس شعور کا نتیجہ تھا کہ ادب محض فردِ واحد کی ذہنی اپج نہیں ہوتا بلکہ یہ مخصوص اداروں کی سرپرستی اور فکری تحریکوں کے اجتماعی عمل کا زائیدہ ہوتا ہے۔ اس تناظر میں پروفیسر سید وقار عظیم کی تصنیف ''فورٹ ولیم کالج: تحریک اور تاریخ'' ادارہ جاتی تاریخ نگاری کا ایک عمدہ نمونہ ہے۔ یہ کتاب محض ایک کالج کی تعلیمی سرگرمیوں کا احاطہ نہیں کرتی بلکہ یہ اس حقیقت کو منکشف کرتی ہے کہ کس طرح ۱۸۰۰ء میں قائم ہونے والے اس ادارے نے پہلی بار شمالی ہند میں تصنیف و تالیف کو ایک منظم اور اجتماعی شکل دی۔ پروفیسر وقار عظیم نے ثابت کیا کہ فورٹ ولیم کالج محض نووارد انگریز افسران کو زبان سکھانے کا مرکز نہیں تھا بلکہ یہ ایک باقاعدہ ادبی تحریک تھی جس نے اردو نثر کو مسجع و مقفیٰ عبارت آرائی کے تکلفات سے نکال کر سادگی اور سلاست کی راہ پر گامزن کیا۔ انہوں نے اس ادارے کے مصنفین (جیسے میر امن، حیدر بخش حیدری، شیر علی افسوس) کی انفرادی صلاحیتوں کو ادارے کے اجتماعی مقاصد کے ساتھ جوڑ کر دیکھا۔ حیدر بخش حیدری کے اسلوب اور ادارے کے اثرات کا جائزہ لیتے ہوئے وہ لکھتے ہیں:

> ''اب تک حیدر بخش حیدری کی جن کتابوں کے اقتباسات ہماری نظر سے گزرے انہیں دیکھ کر یہ نتیجہ نکالنا آسان ہے کہ سادگی و سلامت حیدری کے طرز بیان کی سب سے بڑی خصوصیت ہے وہ جس موضوع پر بھی قلم اٹھائیں اپنے خیالات کو سلیس اور سیدھی سادی عام فہم زبان میں بڑی روانی اور بے تکلفی سے بیان کر دیتے ہیں۔''(4)

ادارہ جاتی تاریخ نگاری کے متوازی، تحریکاتی تاریخ نگاری کا ایک مضبوط سلسلہ ڈاکٹر انور سدید کی تحقیق ''اردو ادب کی تحریکیں'' کی صورت میں سامنے آتا ہے۔ یہ کتاب ادب کو جمود اور حرکت کے جدلیاتی عمل (Dialectical Process) کے طور پر دیکھتی

ہے۔انور سدید نے تاریخ کو محض واقعات کا تسلسل سمجھنے کے بجائے اسے فکری رویوں کے ٹکراؤ اور نئے رجحانات کے جنم لینے کا عمل قرار دیا۔ان کے نزدیک کوئی بھی ادبی تحریک اس وقت جنم لیتی ہے جب معاشرے میں ٹھہراؤ آجائے اور تخلیقی سطح پر بے اطمینانی پیدا ہو۔انہوں نے علی گڑھ تحریک کو اردو ادب کی تاریخ میں ایک ''پیراڈائم شفٹ'' (Paradigm Shift) کے طور پر پیش کیا، جس نے ادب کا رشتہ محض لفظی بازی گری سے توڑ کر معنی اور مقصدیت سے جوڑا۔انور سدید کے تجزیے کے مطابق فورٹ ولیم کالج نے انگریز حکمران کی ہیئت سنواری تھی تو علی گڑھ تحریک نے اس میں روح پھونکی۔ علی گڑھ تحریک کی اس فکری معنویت کو وہ ان الفاظ میں بیان کرتے ہیں:

> ''علی گڑھ تحریک اُردو کی اولین فکری تحریک تھی۔اس تحریک سے پہلے زبان کی ظاہری ہیئتوں پر توجہ صرف ہوئی تھی۔اُردو زبان کا استخوان ہندوستانی لیکن مغز ایرانی تھا اس تحریک نے ان دونوں میں جسم اور روح کا رشتہ قائم کیا اور لفظ کے حسن کو اجاگر کرنے کے بجائے روح اور معنی کو اہمیت دی۔''(5)

ادبی تاریخ کے اس سفر میں ۱۸۰۰ء سے ۱۸۵۷ء تک کا درمیانی عہد (جو فورٹ ولیم سے علی گڑھ تک پھیلا ہوا ہے) ایک پل کی حیثیت رکھتا ہے۔ڈاکٹر عابدہ بیگم نے اپنی تحقیق میں اس بات کی طرف اشارہ کیا ہے کہ علی گڑھ تحریک کی عقلیت پسندی اور نیچرلزم کے بیج دراصل اسی عبوری دور میں بوئے جا چکے تھے۔چنانچہ تاریخ نگاری کا یہ اسلوب ہمیں بتاتا ہے کہ ادبی تحریکیں اچانک رونما نہیں ہوتیں بلکہ ان کے پیچھے اداروں (جیسے دلی کالج اور فورٹ ولیم) اور سماجی و سیاسی حالات کا ایک طویل اور مربوط عمل کارفرما ہوتا ہے۔ڈاکٹر انور سدید نے تحریک کے فلسفے کو مزید گہرائی میں جا کر سمجھایا ہے اور اسے انسانی وجود کی تخلیقی سرشت سے تعبیر کیا ہے۔ان کے نزدیک تحریک جمود کو توڑنے کا نام ہے، اور یہی عمل تاریخ کو آگے بڑھاتا ہے۔ تحریک کی ماہیت پر ان کی یہ رائے ادبی تاریخ کے فلسفیانہ شعور کی عکاسی کرتی ہے:

> ''تحریک جمود کی ایک رنگی کو توڑ کر ہمہ رنگی اور تنوع پیدا کرنے کا عمل ہے اور اس کی تہہ میں تحرک کا کوئی نہ کوئی عنصر ضرور کارفرما ہوتا ہے۔۔۔ابتدائے کائنات کے ان ایام میں زندگی ہموار اور احکام خداوندی کے تابع تھی اور آدم عمل تغیر سے ناآشنا تھا۔اس لئے اسے جمود کی فضا کہا گیا۔''(6)

اس طرح ادارہ جاتی اور تحریکاتی تاریخ نگاری نے اردو ادب کے مطالعے کو انفرادی سوانح عمریوں سے نکال کر اجتماعی شعور اور فکری ارتقاء کے وسیع تر کینوس پر منتقل کر دیا۔پروفیسر وقار عظیم اور ڈاکٹر انور سدید جیسے مورخین نے ثابت کیا کہ ادب کی تاریخ دراصل اداروں کے عروج و زوال اور تحریکوں کے بننے اور بگڑنے کی تاریخ ہے، اور کسی بھی بڑے ادیب یا شاعر کو اس کے ادارہ جاتی وابستگی یا تحریکاتی پس منظر سے کاٹ کر سمجھنا ناممکن ہے۔

اردو ادبی تاریخ نگاری کے ارتقائی عمل میں ڈاکٹر جمیل جالبی کی ''تاریخِ ادبِ اردو'' (چار جلدیں) ایک ایسے عہدِ آفریں موڑ کی حیثیت رکھتی ہے جہاں تاریخ نویسی قیاس آرائیوں اور تذکرہ نگاری کی روایت سے نکل کر ''سائنسی تحقیق'' اور ٹھوس دستاویزی شواہد کے

دور میں داخل ہوتی ہے۔ڈاکٹر جمیل جالبی کا منہاجِ تاریخ محض واقعات کی زمانی ترتیب تک محدود نہیں تھا بلکہ انہوں نے مخطوطات کی ورق گردانی،بنیادی مآخذ کی بازیافت اور متن کی صحت کو اپنی ترجیحات میں سرِ فہرست رکھا۔انہوں نے ادب کو خلا میں معلق جزیرے کے بجائے ایک ''تہذیبی اکائی'' کے طور پر پرکھا اور زبان کے ارتقاء کو کلچر کے وسیع تر تناظر میں دیکھا۔ان کا یہ تحقیقی رویہ انہیں ایک ایسے ''فردِ واحد'' کے روپ میں سامنے لاتا ہے جس نے تنِ تنہا وہ کام سرانجام دیا جو بڑے بڑے ادارے وسائل کی فراوانی کے باوجود نہ کر سکے۔اپنی اس ان تھک محنت اور تحقیقی منہاج کی وضاحت وہ خود ان الفاظ میں کرتے ہیں:

> ''تاریخ ادب ادارے لکھتے ہیں جن کے پاس سرمایہ ہوتا ہے جنہیں ہر قسم کی سہولت میسر ہوتی ہے، جن کے پاس اپنا کتب خانہ ہوتا ہے اور دوسرے کتب خانوں سے وہ قلمی و مطبوعہ کتب مستعار لے سکتے ہیں۔۔۔ لیکن مجھے اس قسم کی کوئی سہولت میسر نہیں تھی۔دن بھر گردشِ روزگار اور پیٹ کا دوزخ بھرنے کے لئے مشقت کی چکی،نہ کوئی مدد گار،نہ کوئی ساتھی۔ایک ایک کتاب کے لئے مختلف کتب خانوں کے چکر کاٹنے پڑے۔''(7)

جالبی صاحب کے منہاج میں ''چھان پھٹک'' (Scrutiny) کا عمل انتہائی سخت گیر ہے۔وہ ثانوی ذرائع پر اکتفا کرنے کے بجائے اصل ماخذ تک پہنچنے کی سعی کرتے ہیں۔ان کی تاریخ کا ہر باب معلومات کی کثرت اور جزئیات نگاری کا نمونہ ہے۔مثال کے طور پر جب وہ دکنی دور یا اٹھارویں صدی کا احاطہ کرتے ہیں تو نہ صرف شعرا کے دواوین کا تجزیہ کرتے ہیں بلکہ اس عہد کی لسانی تبدیلیوں، سماجی محرکات اور سیاسی اتھل پتھل کو بھی زیرِ بحث لاتے ہیں۔ان کی تحقیق کا دائرہ کار اتنا وسیع ہے کہ مشفق خواجہ جیسے نقاد نے ان کی کاوش کو اردو ادب کی ''پہلی باقاعدہ تاریخ'' قرار دیا۔ان کے نزدیک تاریخ محض ادیبوں کی قطار لگانے کا نام نہیں بلکہ یہ ایک مسلسل بہاؤ ہے جو ماضی کو حال سے جوڑتا ہے۔اس تسلسل اور ربط کے بارے میں ان کا اپنا بیان ملاحظہ ہو:

> ''میرا کام جسے میں نے تاریخ ادب اُردو کا نام دیا ہے چار جلدوں میں ہے۔اس کی پہلی جلد آپ کے سامنے ہے جو آغاز سے لے کر ۱۷۵۰ء تک قدیم اُردو زبان و ادب کا احاطہ کرتی ہے۔یہ جلد اپنی جگہ مکمل بھی ہے اور دوسری جلد سے مربوط و پیوستہ بھی۔واضح رہے کہ یہ جدید انداز کی مربوط تاریخ ہے، متفرق مقالات کا مجموعہ یا تذکرہ نہیں ہے۔''(8)

تاہم،ڈاکٹر جمیل جالبی کے منہاج میں تحقیق کا غلبہ بعض اوقات تنقیدی بصیرت پر حاوی نظر آتا ہے۔ان کا مزاج بنیادی طور پر ایک ''محقق'' کا ہے،جو ہر چھوٹے بڑے واقعے کی تصدیق اور ہر مخطوطے کی تفصیلات درج کرنے کو ناگزیر سمجھتا ہے۔اس رویے نے ان کی تاریخ کو ''انسائیکلوپیڈیا'' جیسی ضخامت تو عطا کر دی لیکن بعض مقامات پر بیانیے کا تسلسل تحقیق کے بوجھ تلے دب گیا۔مزید برآں،ان کے منہاج میں اردو زبان کے آغاز اور ارتقاء کو خالصتاً اسلامی تہذیب اور مسلمانوں سے منسوب کرنے کے رجحان پر رشید حسن خان جیسے ناقدین نے گرفت بھی کی ہے۔رشید حسن خان کے مطابق لسانی ارتقاء کو جذباتی سطح پر مذہب سے جوڑنا سائنسی تاریخ نگاری کے اصولوں کے منافی

ہے۔اس تنقیدی زاویے کا اظہار ایک تحقیقی مضمون میں یوں کیا گیا ہے:

''مؤلف نے جگہ جگہ اردو کو مسلمانوں سے اور اسلام سے اس طرح وابستہ کیا ہے جیسے ان میں لازم وملزوم کی نسبت ہو۔۔۔ جذباتی سطح پر تو یہ دِل خوش کرنے والی بات ہو سکتی ہے لیکن لسانی ارتقا کی حقیقی بحث کو اس سے کچھ تعلق نہیں۔ لفظوں کو مسلمانوں اور ہندوؤں سے منسوب کرنا بھی غیر اصولی بات ہے اور مؤلف نے یہ کیا ہے۔''(9)

اس کے باوجود، ڈاکٹر جمیل جالبی کا منہاج اردو تاریخ نگاری میں ''استناد'' (Authenticity) کی علامت ہے۔انہوں نے مرزا غالب، ولی دکنی اور میر تقی میر جیسے شعرا کے مطالعے میں جو نئی جہات دریافت کیں اور جس طرح متن کے داخلی شواہد سے نتائج اخذ کیے، وہ ان سے پہلے کے مورخین کے ہاں مفقود تھے۔ انہوں نے ثابت کیا کہ ادبی تاریخ محض ذوق و شوق کا نام نہیں بلکہ یہ ایک سنجیدہ ''سائنسی علم'' ہے جو ٹھوس شواہد اور غیر جانبدارانہ تجزیے کا متقاضی ہے۔ان کی تاریخ انیسویں صدی کے نصف آخر تک کے ادبی سرمایے کا ایک ایسا جامع ریکارڈ ہے جس کے بغیر اردو ادب کا کوئی بھی طالب علم تحقیق کی وادی میں قدم نہیں رکھ سکتا۔ غالب کی روایت پسندی اور جدت کے امتزاج پر ان کی یہ رائے ان کے عمیق مطالعے کی غماز ہے:

''غالب کی اردو غزل کو دیکھا جائے تو انہوں نے غزل گوئی کی روایت کو قائم رکھا ہے۔ غزل، جیسا کہ حسن و عشق کے اظہار کا ذریعہ ہے۔ غالب نے اسے اسی دائرے میں اپنے مخصوص انداز کے ساتھ برقرار رکھا ہے۔۔۔ نہ صرف غزل کی ظاہری فضاء اس میں قائم ہے بلکہ روایتی رموز و کنایات بھی پوری طرح موجود ہیں۔''(10)

اردو ادبی تاریخ نگاری کی روایت، جو رام بابو سکسینہ سے ہوتی ہوئی ڈاکٹر جمیل جالبی تک پہنچتی ہے، بڑی حد تک ''عظیم شخصیات کے کارناموں'' (Great Man Theory) اور ادبی واقعات کی خطی ترتیب (Linear Chronology) کے گرد گھومتی رہی ہے۔اس روایتی بیانیے میں تاریخ کا محور بادشاہوں کا عروج و زوال یا شعرا کے انفرادی دواوین ہوتے تھے، جبکہ سماج کی اجتماعی لہریں پسِ منظر میں رہ جاتی تھیں۔ ڈاکٹر تبسم کاشمیری نے اس فرسودہ ڈگر سے شعوری انحراف کرتے ہوئے اردو تاریخ نگاری میں پہلی بار فرانسیسی ''ہنلز دبستان'' (Annales School) کے فلسفۂ تاریخ کا باقاعدہ اطلاق کیا۔ یہ دبستان، جو ۱۹۲۹ء میں مارک بلوخ اور لوسیئن فیورے کی مساعی سے پیرس میں وجود میں آیا تھا، تاریخ کو سیاسی واقعات کے تنگ دائرے سے نکال کر اسے ''کل وقتی تاریخ'' (Total History) بنانے کا متقاضی ہے۔ تبسم کاشمیری نے اس منہاج کو اپناتے ہوئے یہ موقف اختیار کیا کہ ادب خلا میں تخلیق نہیں ہوتا بلکہ یہ ایک پیچیدہ سماجی، معاشی اور نفسیاتی عمل کا نتیجہ ہوتا ہے۔ چنانچہ ان کے ہاں تاریخ نویس کا کام محض یہ نہیں ہے کہ وہ بتائے 'کس نے کیا لکھا' بلکہ یہ دریافت کرنا ہے کہ 'معاشرے کے اجتماعی لاشعور اور مادی حالات نے اس ادب کو کیسے جنم دیا'۔ اس نئے تاریخی شعور کی وضاحت کرتے ہوئے وہ خود لکھتے ہیں:

''حقیقت یہ ہے کہ فرانس کے ہنلز دبستان (Annales School) کے مؤرخین نے تاریخ کو اس محدود کلاسیکل تصور سے رہائی دلوائی اور اسے ایک وسیع تر معنویت عطا کی۔ ۱۹۲۹ء سے ۱۹۸۹ء تک اس دبستان کی سرگرمیوں نے تاریخ کو ایک نئے رنگ و روپ سے سنوارا۔''(11)

ہنلز دبستان کے زیرِ اثر ڈاکٹر تبسم کاشمیری نے ''شعبہ جاتی مطالعات'' کے تصور کو رد کر دیا۔ روایتی تاریخوں میں سیاسی تاریخ الگ خانے میں اور ادبی تاریخ الگ خانے میں بیان کی جاتی تھی، جس سے دونوں کے درمیان نامیاتی رشتہ قائم نہیں ہو پاتا تھا۔ تبسم کاشمیری نے اس خلیج کو پاٹنے کے لیے ''بین العلومی تناظر'' اپنایا۔ انہوں نے ادب کی تفہیم کے لیے سماجیات، معاشیات، بشریات، دیومالا اور نفسیات جیسے علوم کو تاریخ کا لازمی جزو قرار دیا۔ ان کے نزدیک کسی عہد کے ادبی متن کو سمجھنے کے لیے ضروری ہے کہ اس عہد کے ذرائع پیداوار، طبقاتی تقسیم اور اجتماعی رویوں کو سمجھا جائے۔ یہی وجہ ہے کہ وہ جب اٹھارویں صدی کا جائزہ لیتے ہیں تو وہ صرف سیاسی انتشار کا ذکر نہیں کرتے بلکہ حملہ آوروں کی نفسیات اور معاشی لوٹ مار کے ان اثرات کا تجزیہ کرتے ہیں جنہوں نے ''شہر آشوب'' جیسی صنف کو جنم دیا۔ اس منہاج کے بارے میں ایک محقق کی رائے ملاحظہ ہو:

''ڈاکٹر تبسم کاشمیری کی ادبی تاریخ کا تعلق اس مکتبہ فکر سے ہے جو ادبی تاریخ کو وسیع تناظر میں دیکھنے کا قائل ہے۔۔۔ جب ہم کسی خاص ادبی دور کا تجزیہ کریں گے تو اپنا تجزیہ محض ادب کے شعبہ تک محدود نہیں رکھیں گے۔ بلکہ اس دور کے سماجی علوم، اقتصادیات، دیومالا، سیاسی تاریخ، تہذیبی و ثقافتی عوامل، فلسفہ اور نفسیات وغیرہ کی روشنی میں اس دور کا تجزیہ مکمل کریں گے۔''(12)

ہنلز دبستان کا ایک اور اہم اصول ''نیچے سے ابھرتی ہوئی تاریخ'' (History from Below) ہے، جس کا اطلاق تبسم کاشمیری کے ہاں بخوبی نظر آتا ہے۔ روایتی مورخین (جیسے محمد حسین آزاد یا مہیش پرشاد) کی توجہ کا مرکز اشرافیہ، دربار اور خواص ہوتے تھے، لیکن تبسم کاشمیری نے عوام الناس، ان کے دکھ سکھ اور ان کی نفسیاتی کیفیات کو تاریخ کا موضوع بنایا۔ مثال کے طور پر جب وہ احمد شاہ ابدالی کے حملوں کا ذکر کرتے ہیں تو وہ مغل بادشاہوں کی شکست و ریخت کے بجائے دلی اور پنجاب کے عام شہریوں کی اس ''اجتماعی بے بسی'' اور نفسیاتی شکستگی کا نقشہ کھینچتے ہیں جس نے اس عہد کے ادب میں یاسیت اور قنوطیت بھر دی۔ انہوں نے دکھایا کہ کس طرح معاشی بدحالی نے ایک عام آدمی کے خواب چھین لیے تھے اور یہی محرومی ادب کا موضوع بنی۔ یہ زاویہ نگاہ اردو تاریخ نگاری میں ایک نئی روایت کی بنیاد رکھتا ہے جہاں ادب صرف خواص کا مشغلہ نہیں بلکہ عوامی تاریخ کا عکاس ہے۔ اس حوالے سے ایک تجزیہ دیکھیے:

''ڈاکٹر تبسم ادبی تاریخ نویسی کی جدید تکنیک ''نیچے سے ابھرتی ہوئی تاریخ'' کا استعمال کرتے ہوئے احمد شاہ ابدالی کے حملے اور اُس کی فتح کے بعد کی دلی اور پنجاب کی تباہی کا جائزہ لیتے ہیں۔ وہ۔۔۔ نہ تو مغل خاندان کا۔۔۔ نقشہ کھینچتے ہیں

اور نہ وہ ہی فوج کی شکست کے حالات دکھاتے ہیں، بلکہ وہ عام آدمی کی معاشی، معاشرتی بدحالی اور ابتری کے ساتھ ساتھ ان کی ذہنی کیفیات اور احساسات کو پیش کرتے ہیں۔"(13)

اس طرح ڈاکٹر تبسم کاشمیری نے روایتی بیانیے کے جمود کو توڑ کر اردو ادبی تاریخ کو یورپی معیارِ تاریخ نویسی کے ہم پلہ لا کھڑا کیا۔ انہوں نے ثابت کیا کہ تاریخ محض ماضی کا مردہ ریکارڈ نہیں ہے بلکہ یہ سماج، معیشت اور انسانی نفسیات کے باہمی تعامل کا ایک زندہ عمل ہے۔

اردو ادبی تاریخ نگاری میں "دبستانِ لکھنؤ" کی تفہیم و تشریح طویل عرصے تک مولانا الطاف حسین حالی کے قائم کردہ اخلاقی معیارات اور "مقدمہ شعر و شاعری" کے زیرِ اثر رہی، جس نے لکھنوی ادب کو ابتذال، تصنع اور زوال کا استعارہ بنا دیا تھا۔ بیسویں صدی کے بیشتر مورخین، بشمول ڈاکٹر سلیم اختر، نے لکھنؤ کے ادبی سرمایے کو بڑی حد تک "اخلاقی تنقید" کی عینک سے دیکھا۔ ڈاکٹر سلیم اختر کی تاریخ میں لکھنؤ کا معاشرہ اور ادب حکمرانوں کی عیش کوشی، طوائف پرستی اور جنسی بے راہ روی کا براہِ راست پرتو معلوم ہوتا ہے۔ انہوں نے واجد علی شاہ کی نجی زندگی اور مصحفی کے معاشقوں کو بنیاد بنا کر پورے عہد کے ادب کو ایک نفسیاتی اور اخلاقی گراوٹ قرار دیا۔ ان کے ہاں لکھنؤ کی تہذیب ایک "بیمار ذہن" کی پیداوار نظر آتی ہے جہاں جنسیت اور نسائیت نے ادب کا حلیہ بگاڑ دیا۔ اس روایتی اور اخلاقی زاویہ نگاہ کی وضاحت ایک تقابلی مطالعے میں یوں کی گئی ہے:

> "ڈاکٹر سلیم اختر نے لکھنؤ کے معاشرے کا جائزہ تو پیش کیا ہے لیکن اس جائزے میں حکمرانوں کی عیش پرستی اور عورت پرستی کا ہی بار بار ذکر ملتا ہے۔ واجد علی شاہ کا ذکر بار بار کیا گیا ہے۔ اس کی محلاتی زندگی، طوائفوں کا ذکر، پکوانوں میں اختراعات۔۔۔ گویا لکھنوی تہذیب کو نا صرف عورت کی تہذیب سمجھا گیا بلکہ پیش بھی اسی تناظر میں کیا ہے۔"(14)

اس کے برعکس، ڈاکٹر تبسم کاشمیری نے دبستانِ لکھنؤ کی "بازیافت" کے لیے اخلاقیات کے بجائے "تہذیبی شعور" کا راستہ اختیار کیا۔ انہوں نے یہ نظریہ پیش کیا کہ کسی بھی عہد کے ادب کو دوسرے عہد یا علاقے (جیسے دہلی) کے اخلاقی پیمانوں پر نہیں پرکھا جا سکتا۔ انہوں نے لکھنؤ کی "جنسی ثقافت" (Erotic Culture) اور "خارجیت" کو اخلاقی جرم کے بجائے ایک مخصوص "سماجی اور معاشی ڈھانچے" کا منطقی نتیجہ قرار دیا۔ ان کے نزدیک لکھنؤ میں جنس اور عیش و نشاط کوئی "گناہ" نہیں تھا بلکہ اسے ایک "فن" اور تہذیبی ضرورت کا درجہ حاصل تھا، جو وہاں کی مادی خوشحالی اور سیاسی فراغت سے پیدا ہوا تھا۔ تبسم کاشمیری نے ثابت کیا کہ لکھنوی شعرا (جیسے جرات اور انشا) کا کلام اخلاقی گراوٹ نہیں بلکہ اپنے عہد کے "تہذیبی معمول" (Cultural Norm) کا عکاس ہے۔ انہوں نے ان تعصبات کو رد کیا جو دہلی کے نقادوں نے لکھنؤ کے خلاف قائم کیے تھے۔

ڈاکٹر تبسم کاشمیری نے لکھنؤ کی بازیافت میں "ریختی" اور "واسوخت" جیسی اصناف کو بھی نیا مفہوم عطا کیا۔ جہاں روایتی اور

اخلاقی نقادان اصناف کو مردانہ معاشرے کی جنسی گھٹن یا ہوس کا شاخسانہ قرار دیتے تھے، وہاں تبسم کاشمیری نے انہیں "عورت کی تہذیب" اور گھریلو خواتین کی نفسیاتی کیفیات کے تناظر میں دیکھا۔ انہوں نے دلائل سے یہ بات منوائی کہ لکھنؤ کا ادب محض تعیش نہیں تھا بلکہ یہ اس معاشرے کی "جمالیاتی حسیت" کا اظہار تھا جس نے زبان کی تراش خراش، مکالمے کی برجستگی اور جزئیات نگاری میں اردو ادب کو مالا مال کیا۔ اس طرح انہوں نے اخلاقی تنقید کے بتوں کو توڑ کر لکھنؤ کو ایک زندہ اور توانا تہذیبی اکائی کے طور پر تاریخ میں محفوظ کیا۔ ان کے اس متوازن رویے نے لکھنؤ کے مطالعے کو تعصبات کی دُھند سے نکال کر روشن کر دیا۔

اردو ادبی تاریخ نگاری کی روایت میں ڈاکٹر تبسم کاشمیری کا سب سے گراں قدر اور اچھوتا اضافہ تخلیق کاروں کی شخصیات اور ان کے فن پارے کی تفہیم میں ''نفسیاتی مطالعے'' (Psychoanalysis) اور ''داخلیت (Interiority) '' کی شمولیت ہے۔ روایتی مورخین، مثلاً رام بابو سکسینہ یا سید اعجاز حسین، عموماً شاعروں کے کوائف، اساتذہ اور تلامذہ کے سلسلے، یا کلام کی ظاہری ہیئت پر اکتفا کرتے تھے، جس سے شاعر کی باطنی دنیا اور اس کے لاشعوری محرکات اوجھل رہتے تھے۔ ڈاکٹر تبسم کاشمیری نے اس سطحیت کو رد کرتے ہوئے یہ موقف اختیار کیا کہ فن پارہ دراصل تخلیق کار کے لاشعور، دبی ہوئی خواہشات، نفسیاتی الجھنوں اور اس کے ''باطنی مرکز'' کا اظہار ہوتا ہے۔ انہوں نے تاریخ کے اوراق میں مدفون شخصیات کو جدید نفسیات، بالخصوص فرائڈ اور ژنگ کے نظریات کی روشنی میں دوبارہ زندہ کیا اور ان کے رویوں کی توجیہات پیش کیں۔ ان کے نزدیک مورخ کا کام محض یہ نہیں کہ وہ بتائے کہ شاعر نے کیا کہا، بلکہ یہ کھوج لگانا ہے کہ اس نے ''ایسا کیوں کہا'' اور اس کے پیچھے کون سا نفسیاتی دباؤ کارفرما تھا۔ اس حوالے سے ان کی تاریخ میں داخلیت کی شمولیت کا اندازہ مندرجہ ذیل اقتباس سے لگایا جا سکتا ہے:

> ''ہر انسان کا اپنا ایک باطنی مرکز ہوتا ہے اور وہ اس باطنی مرکز کی رہنمائی میں سفر حیات طے کرتا ہے۔ قلی قطب شاہ کا باطنی مرکز جنس ہے۔ درحقیقت جنس ہی اس کی شاعری کا باطنی اور بنیادی استعارہ ہے۔ اس کی شاعری ایک او پیرا (Opera) یا رقص کی طرح ہے جس میں مختلف کردار اپنے خوب صورت ملبوس اور حسین بدنوں کے سا تھ نمودار ہوتے ہیں۔''(15)

ڈاکٹر تبسم کاشمیری نے شخصیات کے نفسیاتی تجزیے میں طبّی اور نفسیاتی اصطلاحات کا اطلاق کر کے ادبی تاریخ کو ایک نیا سائنسی اور فکری آہنگ عطا کیا۔ وہ میر تقی میر کی غم پسندی اور یاسیت کو روایتی عاشقانہ ناکامی کے بجائے ایک ''ذہنی عارضے'' کے طور پر دیکھتے ہیں۔ میر کے اس وہم کا ذکر کرتے ہوئے کہ انہیں چاند سے ایک صورت اترتی ہوئی دکھائی دیتی تھی، تبسم کاشمیری اسے تخیل کی پرواز نہیں بلکہ ''پیرانویا'' (Paranoia) اور ''خبط'' (Obsession) قرار دیتے ہیں۔ اسی طرح وہ مرزا رفیع سودا کی ہجو گوئی اور تند مزاجی کو ان کی ''نرگسیت'' اور ''انا پرستی (Egotism) '' کا شاخسانہ قرار دیتے ہیں، جو مجروح ہونے پر ''سادیت'' (Sadism) یا دوسروں کو

اذیت دے کر تسکین حاصل کرنے کے رویے میں ڈھل جاتی تھی۔ یہ تجزیاتی انداز قاری کو شاعر کی شخصیت کی ان گہرائیوں میں لے جاتا ہے جہاں تاریخ اور نفسیات ایک ہو جاتے ہیں۔ میر تقی میر کی نفسیاتی کیفیت کے بارے میں ان کا یہ بصیرت افروز تجزیہ ملاحظہ ہو:

> ''یہ خیال کہ چاند سے ایک خوب صورت خاتون کا پیکر اتر کر میر کی طرف آتا تھا، جس سے آخر شب تک صحبت رہتی تھی، میر کا خبط (Obsession) تھا۔ نفسیات کے مطابق یہ Paranoia کی صورت تھی۔ ایسی کیفیت میں ذہنی حالت کی تبدیلی یا خلل کے سبب مریض کے ذہن میں ایسے خیالات آتے ہیں جو اس کے اپنے بس میں با لکل نہیں ہوتے۔۔۔ میر اس ذہنی مرض کا شکار ہوئے تھے۔''(16)

داخلیت کی یہ شمولیت صرف انفرادی سطح تک محدود نہیں رہتی بلکہ ڈاکٹر تبسم کاشمیری اسے پورے عہد کے ''اجتماعی لاشعور'' کو سمجھنے کے لیے بھی استعمال کرتے ہیں۔ وہ لکھنؤ کے معاشرے میں پنپنے والی ''ریختی'' اور ''جنسی شاعری'' کو محض اخلاقی گراوٹ نہیں سمجھتے بلکہ اسے ایک ایسے معاشرے کی نفسیاتی ردعمل قرار دیتے ہیں جو سیاسی اور عسکری میدان میں شکست کھا چکا تھا اور اپنی مردانگی کی توثیق کے لیے جنس اور نشاطیہ سرگرمیوں میں پناہ لے رہا تھا۔ انہوں نے نواب شجاع الدولہ اور دیگر حکمرانوں کی جنسی بے راہ روی کو ''جنونِ شہوت'' (Erotomania) اور ''مرضِ ہوس'' (Satyriasis) کے ذیل میں رکھ کر پرکھا، جس سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ تاریخ کے بڑے واقعات کے پیچھے اکثر نفسیاتی عوارض کارفرما ہوتے ہیں۔ اسی طرح خواجہ میر درد کے صوفیانہ لبادے کو وہ ایک ''نقاب'' (Persona) قرار دیتے ہیں جس کے پیچھے ایک سپاہی اور عاشق چھپا بیٹھا ہے۔ نفسیاتی تجزیے کی یہ پرتیں ادبی تاریخ کو سپاٹ بیانیے سے نکال کر انسانی نفسیات کا ایک مرقع بنا دیتی ہیں۔ اس منفرد زاویہ نگاہ کے بارے میں ذکاءاللہ لکھتے ہیں:

> ''ڈاکٹر تبسم کاشمیری نے اپنے متخیلہ سے کام لیتے ہوئے تاریخی شخصیات کو تاریخ کے اوراق پر ادبی کردار بنا کر پیش کیا ہے۔ انہوں نے اُردو ادب کی تاریخ کی نامور شخصیات کے دھڑکتے ہوئے دِلوں اور سانس لیتے ہوئے وجودوں کے باطن میں جھانک کر ان کے رنج و غم کی الم ناک تاریخ بھی رقم کر دی ہے۔''(17)

اس طرح ڈاکٹر تبسم کاشمیری نے تاریخ میں ''داخلیت'' کو شامل کر کے یہ ثابت کیا کہ ادب کی تاریخ صرف کتابوں اور سنین کی تاریخ نہیں ہوتی، بلکہ یہ ان انسانوں کے ذہنوں اور جذبات کی تاریخ ہوتی ہے جو اسے تخلیق کرتے ہیں۔ انہوں نے تخلیق کاروں کے نفسیاتی مطالعے کے ذریعے اردو ادبی تاریخ نگاری میں ایک ایسی جہت کا اضافہ کیا جو ان سے پہلے کے مورخین، جیسے ڈاکٹر عابدہ بیگم یا انور سدید، کے ہاں اس شدت اور گہرائی کے ساتھ موجود نہیں تھی۔

اردو ادبی تاریخ نگاری کا سفر محض منہاجیات اور نظریات کی تبدیلی کا نام نہیں ہے بلکہ یہ اسلوبِ بیان کے ارتقاء کی بھی ایک دلچسپ داستان ہے۔ ابتدائی ادوار میں، خاص طور پر تذکروں اور بیسویں صدی کی اوائل کی تاریخوں (مثلاً رام بابو سکسینہ یا سید اعجاز حسین)

میں، تاریخ نگاری کا اسلوب زیادہ تر معلوماتی، سپاٹ اور "کوائف کے اندراج "تک محدود تھا۔ مورخ کا سارا زور سنین کی درستی، تصانیف کی فہرست سازی اور سوانحی خاکوں کی ترتیب پر ہوتا تھا، جس سے تاریخ ایک خشک دستاویز بن کر رہ جاتی تھی۔ ڈاکٹر جمیل جالبی نے اگرچہ تحقیق کی گہرائی اور سائنسی استدلال سے تاریخ کو اعتبار بخشا، مگر ان کا اسلوب بھی بنیادی طور پر ایک محقق کا اسلوب رہا، جہاں فٹ نوٹس، حوالے اور مخطوطات کی تفصیلات اکثر اوقات بیانیے کے بہاؤ (Narrative Flow) میں رکاوٹ بن گئیں۔ اس پس منظر میں ڈاکٹر تبسم کاشمیری نے تاریخ نگاری کے اسلوب میں ایک انقلابی تبدیلی متعارف کروائی۔ انہوں نے تاریخ کو "خشک کوائف" کے قبرستان سے نکال کر اسے ایک زندہ جاوید "تخلیقی بیانیے" (Creative Narrative) میں ڈھال دیا۔ ان کے ہاں تاریخ اور فکشن کی سرحدیں اس فنکاری سے ملتی ہیں کہ تاریخی صداقت مجروح ہوئے بغیر افسانوی دلکشی اختیار کر لیتی ہے۔

اردو ادبی تاریخ نگاری کے اس تفصیلی اور تقابلی مطالعے سے یہ نتیجہ اخذ کیا جا سکتا ہے کہ اردو ادب کی تاریخ کا سفر محض کوائف کی جمع آوری سے شروع ہو کر اب ایک ایسے مقام پر پہنچ چکا ہے جہاں یہ ''سائنس'' اور ''آرٹ'' کے سنگم پر کھڑا ہے۔ ابتدائی دور میں حامد حسن قادری اور دیگر مورخین نے نثر اور نظم کے بکھرے ہوئے اجزا کو سمیٹ کر بنیاد فراہم کی، جسے بعد ازاں پروفیسر وقار عظیم اور ڈاکٹر انور سدید نے اداروں اور تحریکوں کے تناظر میں مزید مستحکم کیا۔ ڈاکٹر جمیل جالبی نے اپنی چار جلدوں کے ذریعے تحقیق، چھان پھٹک اور استناد کا وہ معیار قائم کیا جس نے اردو تاریخ کو تذکرہ نگاری کی روایت سے مکمل طور پر الگ کر کے ایک سنجیدہ علم کی شکل دی۔ ان کا کام ایک انسائیکلوپیڈیا کی حیثیت رکھتا ہے جو ہر آنے والے محقق کے لیے بنیاد کا کام دیتا رہے گا۔

تاہم، اس ارتقائی سفر کا سب سے جدید اور روشن باب ڈاکٹر تبسم کاشمیری کی کاوش ہے۔ انہوں نے ڈاکٹر جمیل جالبی کی تحقیقی روایت کو رد نہیں کیا بلکہ اسے ''ہنلز دبستان (Annales School) '' کے بین العلومی شعور سے ہم آہنگ کر کے تاریخ نگاری کو ایک نیا فلسفہ عطا کیا۔ انہوں نے ثابت کیا کہ تاریخ صرف سنین اور کتابوں کا نام نہیں بلکہ یہ سماج، معیشت، نفسیات اور تہذیب کے باہمی تعامل کا نام ہے۔ ڈاکٹر تبسم کاشمیری نے تاریخ کو ''خشک کوائف'' کے بوجھ سے آزاد کر کے اسے ایک ''تخلیقی بیانیے'' میں ڈھال دیا، جہاں مورخ صرف واقعات ریکارڈ نہیں کرتا بلکہ تخلیق کاروں کے لاشعور اور عہد کے باطن میں جھانکتا ہے۔ انہوں نے لکھنؤ اور دکن کے بارے میں پائے جانے والے روایتی تعصبات کو اپنے تہذیبی وژن سے ختم کیا اور ادب کو اخلاقیات کے بجائے جمالیات اور سماجیات کے پیمانوں پر پرکھا۔ لہٰذا، یہ کہنا بجا ہو گا کہ اردو ادبی تاریخ نگاری اب محض ''ماضی کی بازیافت'' نہیں رہی بلکہ یہ انسانی شعور اور تہذیب کے ارتقاء کو سمجھنے کا ایک ''کل وقتی'' ذریعہ بن چکی ہے، جس میں تبسم کاشمیری کا کام ایک ''پیراڈائم شفٹ'' کی حیثیت رکھتا ہے۔

درج بالا تجزیے کی روشنی میں اردو ادبی تاریخ نگاری کے مستقبل کے لیے درج ذیل سفارشات پیش کی جاتی ہیں:

جیسا کہ حامد حسن قادری، ڈاکٹر محمد ایوب قادری اور ڈاکٹر عابدہ بیگم کے کام سے ظاہر ہوتا ہے، اردو نثر کی تاریخ نگاری ابھی بھی

شاعری کے مقابلے میں کم توجہ کی متقاضی ہے۔ سفارش کی جاتی ہے کہ ۱۸۵۷ء کے بعد کے دور کی نثری تاریخ کو بھی اسی طرح اداروں (جیسے علی گڑھ، جامعہ عثمانیہ) اور سماجی تحریکوں کے تناظر میں الگ سے مرتب کیا جائے، جس میں مذہبی اور غیر مذہبی دونوں طرح کی نثر کا احاطہ کیا جائے تاکہ نثر کے ارتقاء کا ایک مکمل اور مربوط خاکہ سامنے آ سکے۔

ادبی تاریخ میں تخلیق کار کی شخصیت کو محض سوانحی کوائف (پیدائش، وفات، اساتذہ) تک محدود نہیں رہنا چاہیے۔ ڈاکٹر تبسم کاشمیری نے جس طرح میر، سودا اور قلی قطب شاہ کا نفسیاتی تجزیہ کیا ہے، اس روایت کو آگے بڑھاتے ہوئے دیگر اہم ادوار (جیسے ترقی پسند تحریک یا جدیدیت) کے شعرا و ادبا کا بھی نفسیاتی مطالعہ تاریخ کا حصہ بنایا جانا چاہیے تاکہ تخلیق کے لاشعوری محرکات کو سمجھا جا سکے۔

تاریخ کو بوجھل اور خشک ہونے سے بچانے کے لیے ضروری ہے کہ مورخین اپنے اسلوب میں تخلیقی چاشنی پیدا کریں۔ مورخین کو چاہیے کہ وہ ''واقعہ نگاری'' کے ساتھ ساتھ ''منظر نگاری'' اور ''کردار نگاری'' کی تکنیک کو بھی اپنائیں تاکہ تاریخ کا مطالعہ قاری کے لیے دلچسپی کا باعث بنے اور وہ ماضی کو اپنے تخیل میں زندہ کر سکے۔

دبستانِ لکھنؤ اور دبستانِ دہلی کی بحث میں جو اخلاقی اور علاقائی تعصبات (جیسا کہ سلیم اختر وغیرہ کے ہاں نظر آتے ہیں) تاریخ کا حصہ بن گئے ہیں، انہیں مکمل طور پر رد کرنے کی ضرورت ہے۔ سفارش کی جاتی ہے کہ ادب کو ''اخلاقیات'' کے بجائے ''تہذیب'' کے تناظر میں دیکھا جائے (جیسا کہ تبسم کاشمیری نے کیا)۔

حوالہ جات

1. حامد حسن قادری، داستان تاریخ اُردو، اُردو اکیڈمی سندھ، کراچی، ۱۹۸۸ء، ص ا
2. محمد ایوب قادری، اُردو نثر کے ارتقاء میں علما کا حصہ: شمالی ہند میں ۱۸۵۷ء تک، ادارہ ثقافت اسلامیہ، لاہور، ۱۹۸۸ء، ص ۲۳
3. عابدہ بیگم، اردو نثر کا ارتقاء، ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، دہلی، ۱۹۸۸ء، ص ۱۰۶
4. سید وقار عظیم، فورٹ ولیم کالج: تحریک اور تاریخ، یونیورسل بکس، لاہور، ۱۹۸۸ء، ص ۶۷
5. انور سدید، اُردو ادب کی تحریکیں، انجمن ترقی اُردو پاکستان، کراچی، ۱۹۹۱ء، ص ۳۲۱
6. ایضاً، ص 25
7. جمیل جالبی، ڈاکٹر، تاریخ ادب اُردو، (جلد اول) قدیم دور (آغاز سے ۱۷۵۰ء تک) مجلس ترقی ادب، کلب روڈ، لاہور، ص ح
8. ایضاً، ص ز
9. فوزیہ انور، ''ڈاکٹر تبسم کاشمیری کی ادبی تاریخ نگاری''، مشمولہ: سہ ماہی تحقیقی جریدہ، شعبہ اردو، بہاءالدین زکریا یونیورسٹی، ملتان، شمارہ ۱۱، ۲۰۱۹ء، ص ۱۴۷

10. جمیل جالبی، ڈاکٹر، تاریخ ادب اُردو، (جلد چہارم)، علی پرنٹرز، لاہور، 2005ء، ص114
11. تبسم کاشمیری، ڈاکٹر، اردو ادب کی تاریخ، ایم آر پبلی کیشنز، نئی دہلی، ۲۰۰۶ء، ص۹
12. ڈاکٹر طاہرہ صدیقہ، ''تبسم کاشمیری بطور ادبی تاریخ نویس''، مشمولہ: سہ ماہی ماخذ تحقیقی مجلہ، جلد ۳، شمارہ ۲، اپریل تا جون ۲۰۲۲ء، ص ۳۲-۳۳
13. سید اظہر علی، ''ڈاکٹر تبسم کاشمیری کی 'اردو ادب کی تاریخ' کا تکنیکی مطالعہ''، مشمولہ: سہ ماہی معیار، شعبہ اردو، بین الاقوامی اسلامی یونیورسٹی، اسلام آباد، شمارہ ۷، جنوری تا جون ۲۰۱۲ء، ص ۲۹۵
14. ڈاکٹر حنا کنول، "ڈاکٹر تبسم کاشمیری اور ڈاکٹر سلیم اختر کی ادبی تاریخ نگاری اور دبستانِ لکھنؤ"، مشمولہ: سہ ماہی ماخذ تحقیقی مجلہ، جلد ۳، شمارہ ۲، اپریل تا جون ۲۰۲۲ء، ص ۲۷۹-۲۸۰
15. خادم حسین، ''ڈاکٹر تبسم کاشمیری کی تاریخ نویسی اور ادبی تاریخ کے نئے تصورات''، مشمولہ: سہ ماہی بازیافت، شعبہ اردو، اورینٹل کالج، پنجاب یونیورسٹی، لاہور، شمارہ ۳۵، ۲۰۱۹ء، ص ۸۸
16. تبسم کاشمیری، اردو ادب کی تاریخ: ابتدا سے ۱۸۵۷ء تک، سنگِ میل پبلی کیشنز، لاہور، ۲۰۰۳ء، ص ۳۱۶-۳۱۷
17. ذکاء اللہ، ''ڈاکٹر تبسم کاشمیری۔ دور حاضر کا ایک منفرد ادبی مورخ''، مشمولہ: سہ ماہی دریافت، نیشنل یونیورسٹی آف ماڈرن لینگویجز، اسلام آباد، شمارہ ۱۵، ۲۰۱۵ء، ص ۳۰۰

References

1. Qādrī, Ḥ. Ḥ. (1988). *Dāstān-e Tārīkh-e Urdū*. Urdū Academy Sindh.
2. Qādrī, M. A. (1988). *Urdū Nasr ke Irtiqāʾ meṅ ʿUlamāʾ kā Ḥiṣṣa: Shimālī Hind meṅ 1857 tak*. Idārah-yi Saqāfat-i Islāmiyyah.
3. Bēgam, ʿĀ. (1988). *Urdū Nasr kā Irtiqāʾ*. Educational Publishing House.
4. ʿAẓīm, S. W. (1988). *Fort William College: Taḥrīk aur Tārīkh*. Universal Books.
5. Sadeed, A. (1991). *Urdū Adab kī Taḥrīkeṅ*. Anjuman Taraqqī-yi Urdū Pakistan.
6. ibid. (1991). p. 25.
7. Jalībī, J. (n.d.). *Tārīkh-e Adab-e Urdū* (Vol. 1: Qadīm Daur — Āghāz se 1750 tak). Majlis Taraqqī Adab.
8. ibid. (n.d.). p. z.
9. Anwar, F. (2019). Dr. Tabsum Kāshmīrī kī Adabī Tārīkh-Nigārī. *Sih Māhī Taḥqīqī Jarīdah*, 11, 147.
10. Jalībī, J. (2005). *Tārīkh-e Adab-e Urdū* (Vol. 4). ʿAlī Printers.
11. Kāshmīrī, T. (2006). *Urdū Adab kī Tārīkh*. M.R. Publications.

12. Ṣiddīqah, Ṭ. (2022). Tabsum Kāshmīrī baṭaur Adabī Tārīkh-Nawīs. *Sih Māhī Mākhaz Taḥqīqī Majallah*, 3(2), 32–33.
13. ʿAlī, S. A. (2012). Dr. Tabsum Kāshmīrī kī *Urdū Adab kī Tārīkh* kā Taqnīkī Muṭālaʿah. *Sih Māhī Miyār*, 7, 295.
14. Kanwal, Ḥ. (2022). Dr. Tabsum Kāshmīrī aur Dr. Salīm Akhtar kī Adabī Tārīkh-Nigārī aur Dabistān-e Lakhnau. *Sih Māhī Mākhaz Taḥqīqī Majallah*, 3(2), 279–280.
15. Ḥusain, Kh. (2019). Dr. Tabsum Kāshmīrī kī Tārīkh-Nawīsī aur Adabī Tārīkh ke naye taṣavvurāt. *Sih Māhī Bāzyāft*, 35, 88.
16. Kāshmīrī, T. (2003). *Urdū Adab kī Tārīkh: Ibtidā se 1857 tak*. Sang-e Mīl Publications.
17. Ẕakāʾ Allāh. (2015). Dr. Tabsum Kāshmīrī — Daur-e Ḥāżir kā ek munfarid adabī mūrrikh. *Sih Māhī Daryāft*, 15, 300.